سیداحمد بخاریؒ کا انتقال ہوگیا اور آپ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ اب آپ کی کفالت آپ کی زاہدہ و عابدہ ماں بی بی زلیخا کے ذمہ آئی جنھوں نے آپ کو زمانے کے رواج کے مطابق مکتب میں داخل کرادیا۔ قرآن مجید ختم کرنے کے بعد شیخ علاؤالدین اُصولی بدایونی جو اپنے وقت کے جید عالم شمار کیے جاتے ہیں ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور صرف و نحو، زبان عربی، فقہ اور اُصول کی تعلیم حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں بدایوں سے دہلی ہجرت کی اور درسیات کی تکمیل کی۔ جیسا کہ مطلوب الطالبین میں لکھا ہے:

"در علوم ظاہری بجای رسید کہ میان علمای تیز طبع و دانشمندان صاحب ہوش بہ خطاب مولانا نظام الدین محفل شکن مخاطب گردید۔ و در علم حدیث و تفسیر و فقہ و اصول و ہیئت و ہندسہ و منطق و معانی میان علمای معاصر ممتاز شد و علم لغت را فراہم گرفت ....." لہ

جن اساتذہ سے آپ نے کسب فیض کیا اُن میں مولانا علاءالدین اُصولی، شمس الملک خوارزمی اور مولانا کمال الدین زاہد شامل ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ جس نے آپ کی کایا پلٹ دی، اجودھن (پاک پٹن) میں شیخ العالم حضرت فریدالدین گنج شکرؒ (م ۶۷۰ھ) لہ کی خدمت اقدس میں حاضری ہے۔ لہ صاحب بصیرت شیخ نے آپ کو دیکھتے ہی شعر پڑھا ؎

ای آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

اجودھن میں آپ نے سات ماہ سات دن قیام فرمایا۔ بالآخر شیخ نے آپ کو خرقہ خاص عطا کیا اور رخصت کی اجازت دی۔ لہ واپسی پر دہلی کے نواح میں آپ غیاث پور نامی ایک گاؤں میں مقیم ہوگئے جو

لہ مطلوب الطالبین (قلمی نسخہ)

لہ۲ اکثر تذکرہ نویسوں نے سال وفات ۶۶۴ھ تحریر کیا ہے، "ارزش میراث صوفیہ" میں یہی درج ہے۔

لہ۳ یہ واقعہ ۶۵۶ھ کا ہے جب کہ دائرۃ المعارف اسلام میں ۶۵۰ھ تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے۔

"محبوب الٰہی نظام الدینؒ" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور جنہوں نے ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ کو ۸۹ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ اس وقت آپ کے عاشقِ صادق حضرت امیر خسروؒ دہلی میں موجود نہ تھے، جوں ہی یہ خبر ملی دہلی پہنچے اور خانقاہ کے دروازے پر پہنچ کر بے ساختہ کہا ؎

سیہ مکانیست کہ منزلگہ جانان بودہ است
راہ آمد شد آن سرو خرامان بودہ است

شدّتِ غم سے بیہوش ہوگئے اور منہ سے نکلا ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسروؔ گھر اپنے رین بھئی سب دیس

شیخ نظام الدین اولیاؒ کی ذات بابرکات کتاب وسنت کی مُنہ بولتی تصویر، فقر وزہد وتقویٰ و ترکِ علائقِ دنیوی کا ایک ایسا فقید المثال نمونہ تھی جس میں حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کو "آئیڈیل مؤمن" کی جھلک نظر آئی اور "التجائے مسافر" جیسی نظم نے اردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے ؎

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیحؑ و خضرؑ سے اُونچا مقام ہے تیرا (بانگِ درا)

پرہیزگاری، پاک دامنی، توکل و ایثار کے اس روشن مینار نے ہزاروں غیر مسلموں کو ظلمت کدہ ہند میں حلقہ بگوشِ دینِ مبین اسلام کیا اور برصغیر جنوبی مشرقی ایشیا کے طول و عرض میں تبلیغی جماعتیں روانہ کیں اور آپ کا آفتابِ ہدایت تقریباً نصف صدی تک اس خطۂ ارضی کو اپنے نور سے منور کرتا رہا۔ آپ کا ارادت مند و ہمعصر مورخ ضیاء الدین رقمطراز ہے

"... سلطان علاء الدین خلجی (م ۷۱۵ھ) کے عہد کے آخری زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدینؒ نے بیعت عام کا دروازہ کھولا ہوا تھا۔ وہ گناہ گاروں کو خرقہ دیتے اور توبہ کراتے تھے۔ انھیں مریدی میں قبول کرتے،

خواص و عوام، غنی و مفلس، ملاک و فقیر، متعلم و ناخواندہ، شریف و بازاری، شہری و دیہاتی، نمازی و مجاہد، آزاد و غلام، چونکہ یہ سب اپنے آپ کو جناب شیخ کا مرید سمجھتے تھے۔ اس لیے بہت سے نالائق کاموں سے باز رہتے تھے۔ اگر کبھی کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تو وہ پھر سے بیعت کی تجدید کرتا۔ عام خلائق کچھ تقلید سے، کچھ عقیدت سے طاعت و عبادت کی طرف راغب ہوگئی تھی۔ سب لوگ نماز پڑھنے لگ گئے تھے۔ مخیر لوگوں نے دہلی سے غیاث پور تک متعدد جگہوں پر چبوترے بنا کر ان پر چھپر ڈال دیئے تھے اور کنویں کھدوا دیئے تھے۔ ان چبوتروں پر وضو اور نماز کا سامان رکھوا دیا تھا اور ہر چبوترے میں ایک خادم اور حافظ مقرر کر دیا تھا تاکہ شیخ کی خدمت میں آنے جانے والوں کو راستے میں وضو کرنے اور وقت پر نماز ادا کرنے میں دقت نہ ہو۔ چبوتروں پر نمازیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لوگوں کے درمیان اغلب گفتگو نماز، روزہ، نوافل، کم خوری وغیرہ وغیرہ کی بابت ہوتی تھی اور مخیر لوگوں میں حفظ قرآن کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ سلطانی امیر و سلاح دار، منشی و لشکری اور سلطانی غلام جو شیخ کے مرید ہو چکے تھے۔ سلطانی محل میں نماز اشراق و چاشت پڑھتے اور ایام بیض و عشرہ ذی الحجہ میں روزے رکھتے تھے۔ کوئی محلہ ایسا نہ تھا جس میں ہر بیس تیس دن کے بعد اہل صلاح جمع ہو کر سماع صوفیاء نہ کرتے ہوں اور اس میں گریہ و رقت نہ ہو۔ روزوں میں شیخ کے کئی مرید مسجدوں و گھروں میں تراویح میں قرآن مجید ختم کرتے تھے اور بہت سے برگزیدہ مرید رات رات بھر جاگ کر عبادت کرتے، ملک کے اکثر مسلمان عبادت گزاری، تصوف اور ترک تجرید کی طرف مائل اور شیخ کی مریدی کی طرف راغب ہوگئے تھے۔ سلطان علاء الدین اور اس کا گھرانہ شیخ کے مریدوں میں داخل ہوگیا تھا۔ خواص و عوام نیکی و نیکوکاری کی طرف مائل ہوگئے تھے، شراب

اور ہوتے، فحش و فسق و فجور کی باتیں لوگوں کی زبان پر نہ آتا تھا اور کبیرہ گناہوں کو وہ کفر کے برابر سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کی شرم سے مسلمان سود خوری اور غلہ اندوزی کا ارتکاب کھلے بندوں نہ کرسکتے تھے۔ اہل بازار خائف ہوکر جھوٹ کہنے، مال کم تول کر دینے اور فریب کرنے، کھوٹ ملانے اور ناواقفوں کو جُل دینے سے بالکل رک گئے تھے۔ طالب علموں، اشراف و اکابر کو سلوک و طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ قوت القلوب مکی، احیاء العلوم اور ترجمہ احیاء، عوارف المعارف، کشف المحجوب، شرح تعارف، رسالہ قشیریہ، مرصاد العباد، فوائد الفواد وغیرہ کثرت سے بکتی تھیں ....."[۵]

گو آپ نے کوئی تصنیف یادگار نہ چھوڑی مگر آپ کے اکثر ارادت مند مریدوں نے آپ کے ملفوظات جمع کیے، جن میں فوائد الفواد از حضرت امیر حسن سجزی بدایونی (م ۷۳۷ھ) بہت مشہور ہے۔ لکھنؤ کے نسخہ مطبوعہ ۱۳۰۲ھ کے مطابق اس میں ۱۰۷ مجلس کا حال مذکور ہے، جو سوم شعبان ۷۰۷ھ سے شروع ہوکر ۱۹ شعبان ۷۲۲ھ تک پہنچتا ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک نہایت قیمتی و پُراثر کتاب ہے اور بقول برنی اپنے زمانے کی نہایت پسندیدہ و مطلوبہ کتاب شمار کی جاتی تھی۔ یہ کتاب پند و وعظ، سلوک و تصوف، حقائق و معارف، فقہ و حدیث اور رموزِ قرآنی و دینی کی تفسیر و تحلیل کا ایک حسین و پُرمغز مرقع ہے جس کو دیکھ کر خود حضرت محبوب الٰہیؒ نے حسن سجزی سے کہا تھا:

"... نیکو نبشتہ ای، درویشانہ نبشتہ ای و نام ہم نیکو کردہ ای ..."

چند کلمات ہدیۂ قارئین ہیں:-

ایک دن مجلس میں دعا کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی، فرمایا:

"بندہ کو چاہیے، دعا کے وقت کسی گناہ کا جو اس سے سرزد ہوا ہو دھیان میں نہ لائے اور نہ کسی طاعت و بندگی کا خیال کرے۔ اس لیے کہ

طاعت کو خیال میں لانا غرور میں داخل ہے اور اگر گناہ کو دھیان میں
لائے گا تو قبولیت دعا کے یقین میں سستی پیدا ہوگی ۔ پس دُعا کے
وقت خاص نظر اللہ کی رحمت پر رکھنی چاہیے کہ دُعا البتہ قبول ہوگی"

خسروِ شیریں بیان نے اپنے مرشد و محبوب کی مدح میں ایک معرکۃ الآرا ترکیب بند کہا ہے جو کلیاتِ امیر خسرو مسمیٰ تہران کے اوراق کی زینت ہے جس کے ہر شعر سے جوشِ محبت اُبلتی اور عشق ٹپکتا ہے ۔ چند شعر تحریر کیے جاتے ہیں ؎

ای شربت عاشقی بہ جامت — دز دوست زمان زمان پیامت
در سیر وصال ہر دو عالم، — داخل بہ مسافت دو گامت
شد سلک فرید از تو منظم، — زانست کہ شد لقب نظامت
شد جان شریف پاک را چرخ — بگداختہ و نوشتہ نامت
درگاہِ تو قبلہ، و ملائک — پران چون کبوتران بہ بامت
سودا زدگان شوق حق را — تسکین ز مفرح کلامت

جلوہ بہ بقا امت بندہ خسرو
چون شد بہ ہزار جان غلامت

ای خاصہ قرب لی مع اللہ — سرخیل مقربان درگاہ
ای ہای دو چشمہ ہدایت — دادہ بہ دو چشم خود ترا راہ
ہر کس کہ شفیع بُرد نامت — کارش بہ نظام شد ہم آنگاہ
تقدیر بُرون نکردہ راہی — تارای ترا نکردہ آگاہ
ای صوف ہزار بخیہ چرخ — بر قامتِ ہمتے تو کوتاہ
مہ کفش تو گر بہ سر نکردہ — انجم زدہ کفش بر سر ماہ

چون شد دلِ خسرو از تو زندہ
حَيَّاكَ اللهُ فِيْ رِضَاءِ اللهِ

(کلیاتِ خسرو، تہران)

پروفیسر محمد اسلم

شیرازِ ہند
جون پور میں ایک روز

۱۳۵۹ء میں سلطان فیروز شاہ تغلق نے دریائے گومتی کے کنارے اپنے پیش رو جونا خان (سلطان محمد بن تغلق) کے نام کی مناسبت سے جون پور کی بنیاد رکھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس شہر کا شمار برصغیر پاک و ہند کے عظیم تعلیمی و ثقافتی مراکز میں ہونے لگا۔ سلاطین شرقی کے عہد میں جون پور نے بڑی ترقی کی اور ان کی دریا دلی اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی وجہ سے اہلِ فضل و کمال دُور دُور سے یہاں آکر آباد ہوگئے۔ سلطان ابراہیم شرقی (المتوفی ۸۳۶ھ) کو عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے جون پور میں بڑی عالی شان مسجدیں، مدرسے اور محلات تعمیر کرائے جن کی وجہ سے شہر کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے۔

مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۷۸ء کو میں رات کے دس بجے بذریعہ بس شیرازِ ہند جون پور پہنچا اور اولند گنج میں لکشمی ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہ ہوٹل شہر کے ایک گنجان علاقے میں دریائے گومتی کے قریب واقع ہے۔ ہوٹل کے ریستوران میں لوگ ابھی کھانے پینے میں مصروف تھے، انھیں دیکھ کر مجھے بھی تسلی ہوئی کہ اس وقت مجھے بھی کھانا مل جائے گا۔ میں نے سامان ایک کمرے میں رکھا اور نہا دھو کر کھانا منگوایا۔ جون پور کے لوگ گھی کے بڑے شوقین ہیں اور وہاں یہ دستور ہے کہ کھانے کے ساتھ ایک کٹوری میں زیرہ سے بگھارا ہوا گھی بھی ملتا ہے۔ میں نے جون پور کے دستور کے

مطابق سالن میں گی ڈال کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جاکر سو رہا۔

اگلی صبح میں ذرا جلدی بیدار ہوا اور تیار ہوکر ناشتہ کیا اور ایک رکشا والے سے راس منڈل میں پنجابی گوردوارے لے چلنے کو کہا۔ ہوٹل سے قریب ہی گومتی بہتی ہے۔ اس پر منعم خاں نے اکبری عہد میں ۱۵۶۸ء میں افضل علی معمار کی نگرانی میں ایک پختہ پل تعمیر کیا تھا جو تاحال کام دے رہا ہے۔ دریا کے وسط میں ایک جزیرہ ہے منعم خان نے دو پل تعمیر کرکے جزیرے کو دونوں کناروں کے ساتھ ملا دیا ہے۔ دریا کے کنارے کئی مندر اور گھاٹ موجود ہیں جہاں ہندو پوجا پاٹ اور اشنان کرتے ہیں۔ دریا کے شمالی کنارے پر سلطان فیروز شاد تغلق کا تعمیر کردہ قلعہ تا حال موجود ہے، اس کی فصیل کئی جگہوں سے منہدم ہوچکی ہے۔ تاہم یہ ایک قابلِ دید عمارت ہے۔ جون پور اور اس کے تباہ حال قلعے کے بارے میں صفی لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جون پور! اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ
کہہ رہا ہے قلعہ شاہی یہ باحالِ تباہ
مدتوں تک ہند کی ہم بھی رہے ہیں تخت گاہ
ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
ہم سے عبرت کا سبق لو، منظرِ عبرت ہیں ہم

یہاں شاعر سے ذرا سی چوک ہوگئی ہے۔ جون پور شیر شاہ سوری کا مولد نہیں۔ اس کی جائے پیدائش بجواڑہ ہے۔ جون پور میں اس نے طالب علمی کے دن گزارے تھے۔

میں نے اسی تاریخی پل کے ذریعے دریا عبور کیا اور قلعے کے نزدیک سے گزرتا ہوا راس منڈل پہنچ گیا۔ یہاں ایک قدیم رصدگاہ تھی جو راس منڈل کہلاتی تھی لیکن میرے استفسار پر جون پور کا کوئی قدیمی باشندہ بھی اس کا اتہ پتہ نہ بتا سکا۔ میں نے اس سے یہ اندازہ لگایا کہ اب اس کے آثار بھی مٹ چکے ہوں گے۔ ورنہ یہ ایسی غیر معروف عمارت تو نہیں ہونی چاہیے تھی۔

راس منڈل سے میں پنجابی گردوارے پہنچا اور یہاں آکر میں نے رکشا والے کو رخصت کیا۔ ایک عورت گردوارے کا صحن صاف کر رہی تھی؛ میں نے اس سے پنجابی زبان میں مولانا ابوالعرفان ندوی صاحب